سہ ماہی ادبی و تہذیبی مجلّہ

اذکار

29

کرناٹک اردو اکادمی بنگلور

Scanned by CamScanner

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

Scanned by CamScanner

سہ ماہی

اذکار

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

مدیر

اکرم نقاش

کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور

Scanned by CamScanner

AZKAAR
QUARTERLY URDU LITERARY JOURNAL
ISSUE: 29 O 2015

Chief Editor: **Dr. Fouzia Choudhry**
Editor: **Akram Naqqash**
Publisher: **Karnatka Urdu Academy**
Kannada Bhavan, J.C. Road, Bangalore-560002

اذکار

شمارہ (29)

کمپوزنگ : حسن محمود

سرنامے کی خطاطی : اکرم نقاش

سرورق : سید مشتاق فاروق

قیمت : 100 روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

کرناٹک اُردو اکادمی، کنڑا بھون، جے سی روڈ، بنگلور۔560002

فون/فیکس:08022213167

Email:

karnatakaurduacademy@gmail.com
drfouziachoudhary@gmail.com
akramnaqqash61@yahoo.com
akramnaqqash74@gmail.com

اذکار کی مشمولات کی آرا سے کرناٹک اُردو اکادمی کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔

Scanned by CamScanner

مشمولات

اداریہ 05

مضامین

یادوں کی برات، نفسیاتی تناظر میں — ناصر عباس نیر — 09

فطرت اور حقیقت کا شاہ کار ''شکست'' — پروفیسر علی احمد فاطمی — 50

ہندسۂ عبث کا اسیر: اکرام باگ (اندوختہ ایک جائزہ) — خلیل مامون — 76

نعمت خانہ: موہوم حقیقت نگاری کی روشنی میں — انوار الحق — 84

اسّی کے بعد کے شعرا کا ایک اور انتخاب ''غزل کے رنگ'' — آفاق عالم صدیقی — 113

دیوندر ستیارتھی اور نئے دیوتا — عبدالسمیع — 141

خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل: ایک مطالعہ — صفدر امام قادری — 177

فکشن

پرندہ پکڑنے والی گاڑی — غیاث احمد گدی — 203

غیاث احمد گدی کا افسانہ ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'': ایک تجزیہ — خورشید اکرم — 225

ڈھونڈھ پھری چاروں دھام — زاہدہ حنا — 233

راستہ — سلام بن رزاق — 266

اندھیروں کا رپورٹر — رضوان الحق — 273

گفتگو

نئی نظم کی معروف آواز خلیل مامون سے ایک مصاحبہ — اکرم نقاش — 305

Scanned by CamScanner

پرندہ پکڑنے والی گاڑی

غیاث احمد گدی

صبح ہوتی، دن چڑھتا، اور جب ٹھیک نصف النہار پر پہنچتا، شہر میں ایک ایسی گاڑی آتی جو شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی، ٹھیک ویسے ہی جیسے میونسپلٹی کی گاڑی کتے پکڑنے کے لیے نکلتی ہے یہ گاڑی، جو چاروں طرف سے رنگین شیشوں سے بند بے حد خوب صورت ہوتی کہ نگاہ اُٹھ کے داد دیتی۔ اس کے چاروں طرف ننھی ننھی گھنٹیاں بندھی ہوتیں جو چلتے وقت دھیرے دھیرے بج رہی ہوتیں۔ گھنٹیوں کی آواز عجیب ہوتی، کچھ ایسی جیسے کوئی سحر پھونک رہا ہو! ایک لمبا، خمیدہ کمر، زرد رو آدمی گاڑی کو کھینچ رہا ہوتا، بالکل اسی طرح دوسرا آدمی گاڑی کے پیچھے چل رہا ہوتا، جس کے ہاتھ میں پتلا سا بہت لمبا بانس ہوتا، بانس کے سرے پر برش جیسا گچھا سا ہوتا جس پر گوند یا اسی طرح کی چپک جانے والی لیس دار رطوبت لگی ہوتی، جس سے وہ پرندوں کو پکڑتا تھا۔ دیوار پر، چھتوں کی منڈیروں پر، ٹیلیفون کے کھمبوں، پیڑوں یا فرش پر دانہ دنکا چنتے ہوئے پرندے جہاں نظر آتے وہ آدمی بانس کو آگے بڑھا دیتا اور عین پرندوں کے پروں پر لسدار رطوبت لگا ہوا گچھا چھوا دیتا۔ پہلے تو پرندہ تڑپتا چھٹ پٹاتا، اڑنے کی کوشش کرتا پھر تھک ہار کر لسدار رطوبت سے چپڑ چپڑ کرتے ہوئے پروں کی قوت پرواز کے اُلجھ جانے کے باعث ایک طرف اوندھا ہو کر لڑھک جاتا۔ تب وہ آدمی جلدی سے بڑھتا اور دونوں ہاتھوں سے جھپٹ کر پرندے کو پکڑتا۔ دھیرے سے گاڑی

Scanned by CamScanner

کے چھوٹے سے دروازے کو کھولتا، اس میں پرندے کو ڈھکیل دیتا۔ دروازہ بند کرتا، پھر غور سے شیشے کے اندر دیکھتا جہاں پرندہ پھڑ پھڑا کر تھک جاتا، اس وقت اس آدمی کے چہرے پر عجیب سی ہنسی بکھر جاتی اور آنکھیں اندھیرے میں بلّی کی آنکھوں کی طرح چمک اُٹھتیں۔

ہر روز جیسے سورج سروں پر آتا، تیز کرنیں سروں میں گڑتیں، پچھمی دروازے کی جانب سے چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی صدا سنائی دیتی۔ ذرا دیر بعد بڑی سبک خرامی سے ایک آدمی، جس کا چہرہ بے حد زرد ہوتا اور اس کی آنکھیں نیم وا ہوتیں، اس کی کمر سے پتلی سی رسی لپٹی ہوتی، جو گاڑی کے سرے سے بندھی ہوتی اور نیم غنودگی کے عالم میں چلتا بڑھا آتا۔ پھر جہاں کوئی چڑیا کوئی پرندہ نظر آتا، آدمی آپ ہی آپ رک جاتا اور پیچھے چلنے والے آدمی کو پرندے کی طرف اشارہ رکرتا۔ یہ روزمرہ کا دستور ہوتا۔ دوکان دار، دوکانوں میں سوتے، راہ گیر راہ چلتے رہتے، موٹر کاریں تیزی سے پوں پاں کرتی گزرتی ہوتیں، جوتا گانٹھنے والا گانٹھتا رہتا، خرید و فروخت جاری رہتی، شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ لین دین کا بازار اتنا جواں ہوتا کہ اول تو گاڑی کی طرف کسی کی نظر ہی نہ اٹھتی، لیکن ان میں سے کسی کی نظر اُٹھ بھی جاتی تو وہ سحر زدہ سا اس عجیب و غریب گاڑی اور اس کے حسن کو دیکھنے میں کھو جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی آدمی چونکتا اور ذرا حوصلہ سے اُٹھتا، گاڑی والے جب اس آدمی کو قریب آتے دیکھتے تو جھٹ اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور چند سکّے نکال کر اس کی طرف اچھال دیتے، پھر وہ آدمی سکّے چننے میں ایسا محو ہو جاتا کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہتا۔ لوگ یہ منظر دیکھتے اور آنکھوں اور چہروں سے حیرت کا اظہار کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں، یہ عمل کچھ زیادہ دیر نہیں رہتا، فقط چند منٹ، دس یا بیس منٹ تک، پھر حیرت کا یہ

Scanned by CamScanner

وقفہ کم ہوتا گیا اور ہوتے ہوتے محض چند سکنڈ رہ گیا تو، اب اس کے بعد وہ منزل آنے والی تھی کہ لوگ باگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور پرندے پکڑنے والی گاڑی آ گئی ہے، اور پرندہ پکڑتی چلی جا رہی ہے اور آدمی ہے کہ اس کی جانب نظر اُٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔

ایسی ہی کیفیت والا ایک دن تھا، جب میں نے ایک دوکان دار کو جلیبیوں کی تھالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں دیکھو جلیبیوں پر کتنی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں؟..... ابھی جب شہر میں بیماری پھیلی ہوئی ہے، یہ مکھیاں کتنی خطرناک.....!

''مکھیاں.....؟'' حلوائی نے کاہلی سے ہاتھ ہلا کر مکھیوں کو اُڑانے کی کوشش کی۔ مکھیاں ذرا دیر کو اُڑیں پھر جلیبیوں کی تھالی پر ٹوٹ پڑیں۔ ''ہاں مکھیاں تو سالی اُڑتی ہی نہیں۔'' حلوائی نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم کو کیا صاحب، تم کو تو نہیں خریدنا.....''

میں نے جواب میں انکار کیا تو حلوائی نے آنکھ ماری اور سرگوشیوں سے ذرا قریب کے لہجے میں کہا۔

''اور مجھ کو کیا صاحب، مجھ کو بھی تو کھانا نہیں.....!''

بس یہیں سے میں چونک گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے اور شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ اور کوئی پوچھنے والا تو کیا ملے گا، کوئی خدا کا بندہ پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں بات آ گئی۔ میری پیشانی پر جو بہت دیر سے بلکہ کئی دنوں سے ایک تیوری کسی سنتری کی طرح کھڑی دِکھ رہی تھی، سمٹ گئی! پھر میں ہنسا اور میں نے بھی گفتگو کے ذرا دور کے لہجے میں کہا۔ ''تو بھائی حلوائی ایک کام کرو نا، ان گاڑی والوں کی

Scanned by CamScanner

توجہ مکھیوں کی جانب مبذول کرادو.....!''

حلوائی چونک گیا اور اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، لیکن پل بھر میں سنجیدہ ہو گیا۔

''ارے ہاں..... مگر کیوں صاحب، مجھے اس جھنجھٹ سے کیا فائدہ۔؟''

''یہ جو مکھیاں جلیبی کا سارا رس.....''

''ہاں یہ تو ٹھیک کہا سارا رس چوسے چلی جاتی ہیں کم بخت..... مگر صاحب مجھے اس سے کیا نقصان، مجھے تو فائدہ ہے۔''

''وہ کیا.....؟'' میں نے حلوائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا: ''فائدہ کیسے ہے؟''

حلوائی پہلے ہنسا پھر اس نے اپنے بنا پستی میں چپڑے ہوئے توند پر ہاتھ پھیرا اور بے حد سنجیدہ ہو کر میری طرف جھک گیا۔ ''بابو تم کیا جانو دنیاداری۔ یہ راز کی بات ہے۔ دنیا ایسے نہیں چلتی.....''

پھر حلوائی خاموش ہو گیا، اور ذرا گہرا ہو کر پھر گویا ہوا۔ ''پر تو اپنا ہم درد لگتا ہے اس لیے بتاتا ہوں، کسی سے کہنا نہیں۔ تو بابو جلیبیوں کا یہ رس جو مکھیاں چوستی ہیں تو رس اور پھر مکھیاں کہاں جاتی ہیں، ذرا اتنا تو بتاؤ.....؟''

''کہاں جاتی ہیں..... مجھے تو پتہ نہیں، حلوائی یہاں تم ہی بتاؤ؟''

''کہیں نہیں جاتی ہیں.....'' حلوائی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''رس مکھیوں کے پیٹ میں اور مکھیاں جلیبیوں کے ساتھ پلڑے پر،..... سمجھے بابو؟ ایسے فائدہ ہوا!''

لیکن میں بہت دیر تک نہ سمجھ سکا اور بے وقوفوں کی طرح حلوائی کے چہرے کو تکتا

Scanned by CamScanner

رہا۔ حلوائی پھر ہنسا، پھر مونچھوں پر تاؤ دیا۔ ''نہیں سمجھے اب بھی.....؟''

ابھی ہماری یہ گفتگو یہیں تک پہونچی تھی کہ پچھمی دروازے کی جانب سے گھنٹیوں کی آواز سنائی پڑی اور میری توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔ ذرا دیر بعد وہ زرد رو خمیدہ کمر آدمی دکھائی پڑتا ہے۔ حسب دستور اس کی کمر سے پتلی سی رسی بندھی ہوئی تھی، جس کے پچھلے سرے پر وہ گاڑی پھنسی ہوئی تھی۔ آدمی اسی کاہلی سے سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا، پھر گاڑی سامنے آئی جس کے رنگین شیشوں کے اندر دو کبوتر اور ایک گوریا بند تھے۔ کبوتر تو سر نہوڑے ایک طرف کھڑے تھے یا پھر دھیرے دھیرے کاہلی سے سہ قدمی کر رہے تھے، لیکن گوریا تیزی سے ادھر اُدھر پھدکتی پھر رہی تھی اور قدرے اضطراب کے عالم میں تھی۔

اب گاڑی بیچ چوراہے پر آ گئی تھی۔ دھوپ آج روز کی بہ نسبت قدرے سخت تھی اور گاڑی گھسیٹنے والا ہاتھ کو آنکھوں کے اوپر چھجے کی شکل میں کیے آس پاس متجسس نظروں سے جھانکتا پھر رہا تھا، پھر وہ ٹھہر گیا۔ سامنے نالی کے کنارے ایک پرندہ پیاس سے بے حال جھک جھک کر نالی سے پانی پی رہا تھا اور گردن اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھ بھی رہا تھا۔ اسے کسی بات کا خدشہ بھی لگا ہوا تھا۔ جبھی گاڑی کھینچنے والے آدمی نے بانس والے ساتھی کو اشارہ کیا۔ بانس والے نے چپکے سے، لپک کر پرندے کو جالیا۔ ذرا دیر بعد جب اس نے رنگین شیشوں والی گاڑی کے دروازے کا پٹ کھولا اور دھیرے سے پرندے کو اندر ڈھکیل دیا، پرندہ ایک طرف کو لڑھک گیا تو پھدکتی ہوئی گوریا ایک بار زور سے گاڑی کے اندر شیشوں پر پھڑ پھڑانے لگی گوریا بند شیشوں کو توڑ کر نکل بھاگے گی۔ بانس والے آدمی نے مسکرا کر شیشوں کے اندر جھانک کر دیکھا، اس کے چہرے اور آنکھوں میں چمک آ گئی، پھر اس نے شیشے پر ہلکے ہلکے تھپکیاں

Scanned by CamScanner

دیں، یوں گویا سہم کر ایک طرف ہوگئی۔اس کے بعد ویسے ہی ہلکی چال سے گاڑی آگے بڑھی۔گھنٹیوں کی آواز خاموش فضا میں سنائی دی، ٹن ٹن ٹن..... ٹن ٹن ٹن.....

''گئی.....چلی گئی.....''

''ہاں، چلی گئی۔اس پرندے کو بھی لے گئی۔'' جب فضا کا سحر ٹوٹا تو گاڑی اُتری علاقے کے سخت ڈھلان میں اُتر چکی تھی، اور اب دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی، فقط اس کے پہیوں سے اُڑتی ہوئی دھول تھی، جو دھیرے دھیرے فضا سے ہاتھ چھڑا کر بیٹھ رہی تھی۔پھر چند منٹ بعد تماش بینوں کے چہروں پر جو حیرت کے اثرات تھے، وہ زائل ہو گئے اور وہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔!

''اچھا بھائی جان.....یہ پرندے والی گاڑی.....''

سوال کرنے والا رک گیا اور خاصی دیر تک رکا رہا تب میں نے پلٹ کر دیکھا۔ٹھیک میری پشت پر ایک دس گیارہ سالہ لڑکا کھڑا، میری طرف مجسم سوال بنا تک رہا تھا۔

''یہ پرندے والی گاڑی۔'' وہ لڑکا اتنا کہہ کر پھر رُک گیا، جیسے اسے خود پتہ نہیں کہ پوچھنا کیا ہے۔

''ہاں ہاں.....میاں کیا پوچھنا چاہتے ہو پرندے والی گاڑی کے متعلق.....؟''

''جی بھائی جان اتنا کہ.....یہ گاڑی ہے پرندہ پکڑنے والی.....؟''

''ہاں میاں، ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ کیا گاڑی ہے، ہر روز دوپہر میں آتی ہے اور شہر کے جتنے پرندے ہاتھ آتے ہیں سمیٹ کر چل دیتی ہے۔''

Scanned by CamScanner

''اچھا بھائی جان.....'' ذرا دیر بعد اس لڑکے نے یوں چونک کر سوال کیا گویا اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ ''اچھا بھائی جان کیا یہ لوگ باجی کے لقا کو بھی لے جائیں گے؟''

''ہاں ضرور لے جائیں گے، فقط دیکھنے کی دیر ہے.....''

''پھر باجی اچھی کیسے ہوں گی، انہیں لقوہ ہو گیا ہے نا، حکیم جی نے کہا تھا، دواؤں کے ساتھ لقا کبوتر کے پروں کی ہوا بھی چاہیے۔''

لڑکے نے بڑی حسرت سے کہا، یوں کہ میں اس کے افسردہ چہرے کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگا۔

''ہاں ہاں، بات تو ہے سوچنے کی، لقا کبوتر کو نہیں جانا چاہیے.....''

''پھر میں کیا کروں، آپ ہی بتایئے بھائی جان.....میں تو بہت چھوٹا ہوں نا، میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔''

''میری سمجھ میں بھی نہیں آتا میاں.....اور سچی پوچھو تو میں بھی بہت چھوٹا ہوں۔!''

''آپ چھوٹے ہیں.....'' وہ لڑکا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''آپ اتنے بڑے ہیں، واہ.....'' وہ لڑکا پھر قہقہے لگانے لگا۔ میں خاموشی سے بدستور اسے دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں کہا۔ ''میاں تم ہنس رہے ہو''؟

''بھائی جان ایک اور بات پوچھوں؟'' اس نے ذرا ٹھہر کر دوسرا سوال کیا۔

''پوچھو میاں وہ بھی پوچھ ڈالو.....''

''آپ اتنے اُداس، بھائی جان آپ کبھی ہنستے کیوں نہیں؟''

Scanned by CamScanner

میرا جی چاہا سچ سچ کہہ دوں، کیسے ہنسوں میاں، اس کارگہ شیشہ گری میں ہنسنا کوئی کھیل ہے؛ مگر اس معصوم بچے کو جو ذرا دیر پہلے لقا کبوتر کے چلے جانے کی فکر میں اُداس تھا، اور اب ذرا دیر پہلے قہقہے لگا رہا تھا، کچھ نہیں بتا سکا۔ فقط پیار سے اُسے دیکھتا رہا۔

''بھائی جان میں آپ کو ہنسا دوں.....؟'' وہ لڑکا بڑی محبت سے میری طرف بڑھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا..... ''آپ کہئے تو میں آپ کو ہنسا دوں؟''

پہلے تو میں چونکا دفعتاً مجھے عجیب سا لگا، ناسمجھی میں اس لڑکے نے ذرا اپنے قد سے بڑی بات کہہ دی تھی۔ پھر میں نے ذرا محبت سے تاکید کی۔

''میاں آہستہ بولو۔ دھر لیے جاؤ گے، کسی نے سن لیا تو، پولس والوں کو خبر دے گا کہ یہ کیسا لڑکا ہے کہ اس کی بہن بیمار پڑی ہے اور اس کا لقا کبوتر بھی چلا جانے والا ہے، اور یہ ہے کہ خود ہنستا بھی ہے اور دوسروں کو بھی ہنسانے کی سوچتا ہے۔ ہوش کے ناخن لو میاں، مفت میں پکڑے جاؤ گے۔''

''بلا سے پکڑ لیا جاؤں گا۔'' لڑکے نے حوصلے سے کہا۔ ''آپ کہئے تو ہنسا دوں آپ کو۔''

''ہنسا دو میاں بڑا کرم ہوگا، بڑی مہربانی ہوگی تمھاری.....''

''تو پھر دوستی کیجیے۔'' اس نے دوستی کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''تم سے دوستی؟ ارے چھٹنکی، تمھارے اتّے اتّے تو میرے بیٹے ہیں، میں تو تمھارے باپ کے برابر ہوں۔''

''تو کیا ہوا، باپ بھی تو دوست ہوتے ہیں۔ میرے مولوی جی کہتے ہیں، اچھے باپ اپنے بچوں کے دوست بھی ہوا کرتے ہیں۔''

Scanned by CamScanner

''یہ بات ہے..... تو ہوا دوست تمھارا آج سے۔'' میں نے اس کے ننھے سے خوب صورت ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

''پھر چلیے میرے ساتھ ندی کی طرف ،وہاں آپ اور ہم دو ہی ہوں گے۔وہاں میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں گا۔''

اور وہ لڑکا مجھے گھسیٹتا ہوا ندی کی طرف لے چلا۔میں پیچھے پیچھے اور وہ آگے آگے۔راہ گیر پلٹ پلٹ کر ہماری دوستی کو دیکھتے رہے اور ہم پلٹ پلٹ کر راہ گیروں کو تک رہے تھے۔جن کے کوئی دوست تھے بھی یا نہیں،جن کے کوئی ایسے پیارے بیٹے تھے بھی یا نہیں۔اور پھر، جب ہم ندی کے قریب پہونچے تو اس نے پہلے تو چالاک نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا، ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اس نے اپنے نیکر کی جیب سے ماچس کی ایک ڈبیہ نکالی، مسکرایا، میری طرف پلٹا اور گہری سرگوشی میں بولا۔''اس میں ہے.....''

جواب میں میں نے بھی اتنی ہی ہوشیاری سے پہلے بائیں طرف دیکھا، دائیں طرف دیکھا، جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اتنی ہی سرگوشی میں پوچھا۔

''کیا ہے اس میں؟''

''یہ ہے، یہ ہے اس میں۔''لڑکے نے کہا اور جھٹ سے ماچس کے اندرونی حصے کو باہر ڈھکیل دیا۔ماچس کی ڈبیا میں میری آنکھوں کے سامنے ایک بے حد خوش رنگ تتلی نیم جان سی پڑی تھی، جو باہر کی ہوا اور دھوپ لگتے ہی پھڑ پھڑانے لگی۔اس کے ننھے ننھے پروں کے اردگرد زعفرانی رنگ بکھرا ہوا تھا، اور پروں کے عین درمیان زیرہ کے برابر سرخی تھی۔اور اس کے چاروں طرف گلابی رنگ سا چھٹکا ہوا تھا اور پروں کے کناروں پر افشاں

Scanned by CamScanner

چمک رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ بے حد حسین دِکھ رہی تھی۔

میں تتلی کو غور سے دیکھتا رہا تھا اور ذرا دیر رنگوں کی دنیا میں کھویا رہا..... جب تک میں ڈوبتا ابھرتا رہا، وہ لڑکا اتنے ہی انہماک سے میرے چہرے کے خط وخال پر کچھ ڈھونڈتا پھرا۔ میں نے تتلی کی طرف سے نظر اُٹھائی، اس لڑکے کی طرف دیکھا تو وہ قدرے افسردگی سے میری طرف پلٹا..... ''آپ تو عجیب ہیں بھائی جان۔ آپ تو تتلی کو بھی دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔''

''ہاں میاں.....'' مگر میں چونک اُٹھا۔ اس دس برس کے بچے نے تو مجھے بہت دور پہنچ کر پکڑ لیا۔ ''یہ تم نے کیا کہہ دیا کہ میاں میں.....''

''ہاں، بھائی جان.....'' اس نے قطعہ کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو تتلی سے بھی خوش نہیں ہوئے۔ کیسے ہماری دوستی نبھے گی.....؟''

''نہیں نبھے گی میاں، کبھی نہیں نبھے گی.....''

میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا، مگر ساتھ ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے وہ لڑکا بھی ہم راہ رہا..... ''لیکن بھائی جان وہ میرا لقا کبوتر، وہ گاڑی.....''

دوسرے دن میں بازار کے سارے لوگوں سے کہتا پھرا، جوتے گانٹھنے والے موچی سے، کپڑے بیچنے والے بزاز سے، بھیڑوں میں گھرے رہنے والے ڈاکٹر سے، روٹی اور دال بیچنے والے سے، راہ گیروں سے، سفید پتلون والے سے، تیز رفتار بابو سے، بوجھ ڈھونے والے قلی سے، رنگین ڈوپٹے والی خاتون سے جو سڑک پر ہولے ہولے یوں چلتی ہے گویا سارے زمانے کو روند کر گزر جانے کا فیصلہ کر چکی ہے، دونوں سیاست دانوں سے، جو

Scanned by CamScanner

آپس میں سازشی انداز کی گفتگو میں مصروف لپکے چلے جا رہے تھے۔ایک ایک آدمی سے پوچھتا پھرا، تیز رفتار گاڑیوں کو روکنے کی ناکامیاب کوشش کی، کہ دس سالہ بچے کی جوان بہن لقوہ کی مریض ہے اور حکیم جی نے دواؤں کے ساتھ لقا کبوتر کے پروں کی ہوا کے لیے کہا ہے اگر یہ گاڑی والے بچے کے کبوتر کو بھی لے گئے تو پھر کیا ہوگا.....؟

مجھے کسی نے جواب نہیں دیا، سب اپنی دنیا میں مصروف رہے۔اس لیے میں دس سالہ بچے کے سوال کو پی گیا اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔مجھے افسوس تھا، اُداس سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔میرے پاؤں تھک گئے تھے۔

دوپہر سے شام ہونے کو آ گئی تھی۔سرمئی اندھیرے کا جنم ہونے والا تھا کہ میری نظر چوک کے ایک کوٹھے پر گئی، جہاں شہر کی مشہور رنڈی مُنّی بائی بالکونی میں کھڑی بال سنوار رہی تھی، منی بائی کے سامنے اڈے پر اس کا طوطا دائیں بائیں گردن گھما کر جھوم رہا تھا اور وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتی جا رہی تھی۔اور طوطے کو پڑھاتی بھی جا رہی تھی۔

میں چپکے سے کوٹھے پر چڑھ گیا۔اس کے کمرے کو عبور کر کے بالکونی میں عین منی بائی کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔منی بائی میری آمد سے مطلق بے خبر طوطے کو پڑھانے میں محو تھی۔بولو میاں مٹھو، نبی جی روزی بھیجو.....''

میاں مٹھو نے اڈّے میں دائیں بائیں جانب رکھی ہوئی دونوں پیالیوں کو گردن گھما کر دیکھا، پھر ایک پیالی پر جھک کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔منی بائی کی طرف مخاطب ہو کر بولا''نبی جی روزی بھیجو.....''نبی جی روزی بھیجو.....''

''نبی جی روزی بھیجو۔''طوطے نے اسی طرح اکڑ کر کہا۔

Scanned by CamScanner

''سو میں آ گیا۔'' اس کے پیچھے کھڑا، میں نے آہستہ سے کہا۔ منی بائی سن کر چونک اُٹھی۔ اس نے پلٹ کر مجھے گھورا، ذرا دیر کو سہم گئی، پھر ذرا ڈپٹ کر بولی۔ ''تم کیسے چلے آئے جی، کون ہو؟''

''سیڑھیوں سے جی، مجھے نہیں پہچانا، منی بائی، مجھے نبی جی نے تمھارے پاس بھیجا ہے۔''

منی بائی یہ سن کر ہنس پڑی۔ ''اچھا اچھا جی چلو اُدھر بیٹھو تخت پر۔'' اس نے کنگھی کے دانتوں سے سنہرے بالوں کا گچھا نکالا۔ اسے گولی بنا کر اس پر تھوکا پھر نیچے سڑک پر پھینک دیا۔

''بڑی طوطا چشم ہو منی بائی۔ ذرا سے میں طوطے کی طرح رنگ بدلتی ہو؟'' جواب میں منی بائی نے ایک اور رنگ بدلا اور مسکرا پڑی۔

تخت پر بیٹھتے ہوئے میں نے اس کے قدموں پر چودہ روپے کے ایک ایک کے نوٹ رکھ دیے۔

''میرے پاس اتنے ہی ہیں جی، تمھارے نبی جی نے آج بڑے غریب آدمی کو اُدھر بھیجا۔''

''نہیں جی یہ بھی کیا کم ہیں..... ہم تو اپنے آقاؤں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔''

لیکن بہت دیر ہو گئی اور میں نے منی بائی سے کوئی خدمت نہیں لی تو وہ جھلاتی گئی۔ ''یہاں کاہے کو آئے ہو جی..... اور یہ روپے کیوں دیے.....؟''

''منی بائی برا نہ مانو، میں تو صرف اس لیے آیا ہوں کہ تم سے بھی پوچھ دیکھوں، تم کیا کہتی ہو؟''

''کاہے کے بارے میں.....؟''

Scanned by CamScanner

''یہ جو آج کل ہر روز دوپہر میں پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے، اس کو دیکھتی ہو؟''

''ہاں دیکھتی ہوں کبھی کبھی.....''

''تو تمھیں کیسا لگتا ہے.....؟''

''اچھا جی.....اچھا لگتا ہے.....پیلے پیلے لال لال خوب صورت شیشوں میں سے پرندے چہکتے ہوئے بہت بھلے دِکھتے ہیں۔''

''بہت دور سے دیکھتی ہونا..... جتنی دور سے تمھیں تمھارے چاہنے والے دیکھتے ہیں۔''

''ہاں جی، اس بالکونی سے.....''

''منی بائی، کسی دن نیچے جا کر قریب سے دیکھو.....''

''وہ کیوں، مجھے اتنی فرصت نہیں جی'' منی بائی نے ناگواری سے میری اور دیکھا، پھر غالباً اسے میرے چودہ روپے کے نوٹ یاد آ گئے تو وہ مسکرا پڑی۔ ''تم مجھے ذرا قریب سے دیکھو نا جی.....؟''

''سو تو دیکھ ہی رہا ہوں منی بائی اور تم بھی دیکھ لوگی جس دن گاڑی والے تمھارے طوطے کو پکڑ کر لے جائیں گے.....''

''میرے طوطے کو کیوں لے جانے لگے جی۔'' منی بائی نے کڑک کر برجستہ کہا۔ ''یہ کوئی سڑکوں پر پھرنے والا آوارہ پرندہ ہے، یہ تو پالتو ہے میرا ہیرا من۔

''ہاں منی بائی پہلے تو سڑکوں پر پھرنے والے پرندے کو پکڑیں گے پھر..... کچھ دنوں بعد.....لال لال، پیلے پیلے خوب صورت شیشوں کے پیچھے

Scanned by CamScanner

سے اور پرندوں کے درمیان یہ تمھارا ہیرامن طوطا دیکھنے میں کتنا اچھا لگے گا۔تم دیکھو نہ دیکھو، سڑک پر چلنے پھرنے والے لوگ باگ اور دوکان میں سودا سلف بیچنے والے بنیے ضرور دیکھیں گے اور سڑک پر، جو پرندے والی گاڑی والے دونوں آدمی سکے پھینک دیتے ہیں، ان سکوں کو اور لوگوں کے ساتھ تم بھی چننے لگو گی اور یہ بھول جاؤ گی..... کہ.....''

کیا بھول جاؤں گی جی.....؟ بہت سے سکے مل جائیں تو ہیرامن کو کون روتا ہے۔گاڑی والے اگر ڈھیر سارے سکے پھینک دیں گے تو میں سب چن لوں گی .....اور بازار سے نیا طوطا لے آؤں گی!''

''اے ہے منی بائی، ہوش کے ناخن لو، یہ دنیا ہے اور دنیا سالی بڑی مطلبی ہوتی ہے مان لو.....بازار میں طوطا نہ ملا اور ملا تو ایسا پڑھنے والا نہ ملا، اور پڑھنے والا بھی مل گیا تو اس کی زبان میں یہ تاثیر.....''

منی بائی کھلکھلا کر ہنس پڑی، اور کچھ دیر تک ہنستے رہنے کے بعد بولی۔

''واہ بہت اچھا بولتے ہو جی، کہاں رہتے ہو؟..... کیا کام کرتے ہو؟''

''کہانیاں لکھتا ہوں منی بائی، رہنا و ہنا کیا، جہاں پایا رہ لیا، جہاں چاہا سو لیا۔''

''اے کہانیاں لکھنا بھی کوئی کام ہوا۔لگتا ہے تم تو ہم سے بھی گئے گزرے ہو..... تمھارا دھندہ تو ہمارے دھندے سے بھی گیا گزرا لگتا ہے جی..... کیوں جی۔''

''ہاں منی بائی، تم تو ذرا سے میں اکھٹے چودہ روپے رکھوا لیتی ہو اور مجھے چودہ روپے حاصل کرنے کے لیے آٹھ کہانیاں لکھنا پڑتی ہیں۔دو روپے فی کہانی کے حساب سے خریدنے والے دیتے ہیں۔''

Scanned by CamScanner

''دوروپے فی کہانی..... یہ تو بہت کم ہوتے ہیں۔''منی بائی نے مایوسی سے کہا، اچانک اسے کوئی بات یاد آ گئی، دوروپے فی کہانی کے حساب سے آٹھ کہانیوں کے سولہ روپے بنتے ہیں..... باقی دوروپے بھی نکالو جی..... جلدی کرو۔''

''ہاں جی بنتے تو سولہ روپے ہیں، مگر ایک کہانی تو ناپ تول میں چلی گئی؟''

''ناپ تول میں؟ ارے واہ''منی بائی پھر ہنسی۔''ناپ تول میں کیسے چلی گئی؟''

''وہ ایسے کہ جب جریدے والے کے پاس پہنچا اور اسے آٹھوں کہانیاں پڑھائیں تو وہ جھٹ اندر سے ترازو لے آیا۔''

''ترازو؟ کہانیاں کیا تول کر بکتی ہیں؟؟''

''خدا کا شکر ہے منی بائی ابھی تک تو تول کر بکتی ہیں، کچھ دنوں بعد دیکھنا بے تولے بیچنا پڑیں گی۔''

''اچھا اچھا، پھر وہ ترازو لے آیا.....''منی بائی نے دل چسپی سے کہا۔

''ہاں ترازو لے آیا۔ ڈنڈی ملائی تو ایک طرف پاسنگ تھا۔ اس نے جھٹ آدھی کہانی نوچ لی اور دوسری طرف والے پلڑے پر رکھ دی۔ جب پاسنگ برابر ہو گیا، ایک طرف وزن کے سات پتھر رکھے اور دوسری طرف ساڑھے سات کہانیاں۔''

میں نے کہا۔''وزن کے سات ہی پتھر رکھے گئے ہیں، دیکھو تو کہانی والا پلڑا کتنا جھک آیا ہے..... آدھی کہانی تو تم نے پہلے لے لی.....''

''پہلے لے کر آدھی کہانی کیا میں کھا گیا، پاسنگ نہ ملا تو ترازو کا؟''جریدے والے نے چڑ کر کہا۔

Scanned by CamScanner

''بات سچ تھی۔''میں نے جلدی سے کہا۔''اچھا ٹھیک ہے،تم سچ کہتے ہو، پھر دوسری طرف کا پلڑا جو اتنا جھک آیا ہے۔

منی بائی، یہ سن کر جریدے والا بگڑ گیا، ترشی سے کہا۔اتنا جھک گیا تو دم نکل گیا تمھارا، کیا سونا تول رہے ہو، کہانیاں ہی تو ہیں۔''

''سچ ہی کہا جریدے والے نے۔''منی بائی نے میری طرف ہم دردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر مجھے دل برداشتہ دیکھ کر منی بائی نے دکھ سے کہا۔''واقعی ہمارا دھندہ تمھارے دھندے سے بہت اچھا ہے۔''

''ہاں منی بائی بہت اچھا ہے۔اسی لیے کبھی کبھی جی چاہتا ہے کاغذ قلم پھینک تمھارا والا دھندہ ہی شروع کر دوں۔''

یہ سن کر منی بائی بے ساختہ ہنس پڑی اور جلدی سے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھک لیا۔

''اللہ، ایسا نہ کر بیٹھنا جی، ورنہ مفت میں ہماری روٹی ماری جائے گی.....''

بہت دیر تک ہنستے رہنے کے بعد جب منی بائی تھک گئی تو اسے کچھ یاد آیا۔

''اچھا جی، ایک کہانی ہم پر لکھو.....''

''نہیں منی بائی تم پر تو بہتوں نے کہانیاں لکھی ہیں، میں تو تمھارے طوطے پر ایک اچھی سی کہانی لکھنا چاہتا ہوں''

''لکھو جی، ضرور لکھو..... میرے طوطے پر ہی لکھو.....''منی بائی نے

Scanned by CamScanner

مسرت سے کہا۔ ''مگر کیا لکھو گے؟''

''یہ لکھوں گا کہ..... پرندہ پکڑنے والی گاڑی آ گئی ہے، اور اب، جب بازار کے سارے پرندے ختم ہو چکے ہیں۔ رنگین شیشوں سے گھری ہوئی گاڑی والے دونوں زہریلی آنکھوں والے آدمی چاروں اور گھوم کر ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے کوئی پرندہ ہاتھ آ جائے، کہیں سے کوئی گوریا، قمری، بلبل، کہیں سے کوئی کرک، نیل کنٹھ، کوئی مینا، کوئی طوطا دکھائی پڑے۔ اتنے میں ان کی چاروں زہریلی نگاہیں، تمھارے طوطے پر پڑتی ہیں اور وہ دونوں کھل اُٹھتے ہیں۔ پھر لمبے بانس والا آگے بڑھتا ہے اور چپکے سے طوطے کے بائیں بازو پر لسدار رطوبت والے گچھے کو چھوا دیتا ہے۔ طوطا پھڑ پھڑاتا ہے، تھرتھراتا ہے، اُڑنے کی کوشش کرتا ہے اور برسوں کے اڈے کو غیر محفوظ جان کر بالکونی کی ریلنگ کا سہارا لینا چاہتا ہے، مگر نہیں لے پاتا اور تڑپتا ہوا نیچے آ رہتا ہے۔ جہاں وہ آدمی کھڑا ہوتا ہے۔ وہ لپک کر طوطے کو اُٹھاتا کہ طوطا..... چیں..... ں ں..... کی آواز سے زور سے چیختا ہے، پھڑ پھڑاتا ہے۔ پھر پتہ نہیں اس کی ساتھ چھوڑتی ہوئی قوت پرواز کہاں سے لوٹ آتی ہے وہ ذرا اوپر اُڑتا ہے لیکن پھر گرتا پڑتا ہے۔

وہ آدمی جس کی کمر سے گاڑی والی رسی بندھی ہوتی ہے، اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھتا ہے اور اطمینان سے مسکرا دیتا ہے، جس کے جواب میں اس کا رفیق پہلے اپنے ساتھی کو دیکھتا ہے، پھر فرش پر ہانپتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہے۔ اس کے بعد پھر اپنے ساتھی کو دیکھ کر اطمینان سے مسکرا دیتا ہے اور آہستہ سے آگے بڑھ کر طوطے کو اُٹھانے کے لیے جھکتا ہے۔

لیکن دفعتاً طوطا اس کی گرفت میں آنے کی بہ جائے تڑپ کر اچھلتا ہے اور اس کی

Scanned by CamScanner

کنپٹیوں پر جھپٹتا ہے اور گردن کا گوشت نوچ لیتا ہے۔

اس آدمی کے منہ سے چیخ نکلتی ہے جسے سن کر اس کا دوسرا ساتھی لپکتا ہے اور طوطے کی گردن پر ہاتھ ڈالنا ہی چاہتا ہے کہ طوطا گھور کر دوسرے آدمی کو دیکھتا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل جاتی ہیں اور ان میں لہو اُتر آتا ہے۔ وہ اپنی پوری طاقت کو سمیٹتا ہے اور دہل کر دوسرے آدمی پر بھی حملہ کرتا ہے اور اس کے سارے چہرے کو نوچ کر لہولہان کر دیتا ہے۔ وہ آدمی بھی جھلا اُٹھتا ہے، اور جلدی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے طوطے کو اپنے سے الگ کرتا ہے اور اسے زور سے زمین پر پھینک دیتا ہے۔

اب دونوں طوطے کے اطراف کھڑے اسے حیرت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور طوطا آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا کبھی پہلے آدمی کی طرف جاتا ہے، پھر اسی اطمینان خاطر سے ٹہلتا ہوا دوسرے آدمی کی طرف جاتا ہے، اور دونوں کو اپنی خوں آشام نظروں سے گھور رہا ہوتا ہے.....

''.....اور اتنے میں۔'' منی بائی جلدی سے کہہ اُٹھتی ہے۔ ''میں لپک کر آجاتی ہوں اور اپنی چادر اس پر ڈال دیتی ہوں اور پرندے کو پکڑ کر گاڑی والے کے حوالے کر دیتی ہوں اور اس سے بہت سے.....''

''.....جب بہت سے پیسے ملنے والے ہوں تو کیا میں طوطے کو یہ سب کرنے دوں گی.....''

منی بائی حقارت سے میری طرف دیکھتی ہے، اور تھوک دیتی ہے ''ایسی ہی کہانی لکھی جاتی ہے.....جی؟''

Scanned by CamScanner

جواب میں میں منی بائی کے چہرے کو دیکھتا ہوں۔ اڈے پر اِدھر سے اُدھر ہوتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہوں اور پھر ایک بار پلٹ کر طوطے کو دیکھتا ہوں.....

پھر گاڑی والے منی بائی کے نبی جی سے ''روزی بھیجو'' کی منت کرنے والے طوطے کو بھی لے جاتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ شہر سونا ہوتا جاتا ہے۔ کہیں کوئی پرندہ، کوئی گوریا، کوئی بلبل، مینا، طوطا، کوئی مرغ، کوئی فاختہ نظر نہیں آتی۔

شام ڈھلے، درختوں پر بسیرا لینے والی چڑیوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی، لاجوردی آسمان پر سفید بگلے، توازن سے اُڑنے والے بگلے بھی دکھائی نہیں دیتے، بھری دوپہر کی خاموش فضا میں چیلوں کی درد بھری چیخ بھی سنائی نہیں دیتی، کبوتر کی غٹرغوں، چیپے کی پی کہاں، مینا کی ٹوئیں ٹوئیں کی آواز سے کان محروم ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ مولوی صاحب کے مرغ کی اذان بھی کہیں کھو گئی ہے۔

لیکن بازار اور رونق بازار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ خرید و فروخت جاری ہے، شور شرابہ، یکہ والوں کی کھٹ کھٹ، ٹم ٹم والوں کے گھوڑوں کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں، لمبی اور خوب صورت کاریں زوں زوں کر کے گزر جاتی ہیں، آمد و رفت جاری ہے، کاروبار بہ دستور ہے، خریدنے والے اسی طرح بازار کی دوکانوں پر جمے رہتے ہیں اور بیچنے والے اسی انہماک سے سودا سلف بیچ رہے ہیں ایک ہنگامہ ہے کہ جاری ہے، ایک دوڑ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔

پھر دن ڈھلتا، پھر رات آتی ہے اور اپنے تمام چھوٹے بڑے، کھرے کھوٹے، سچے جھوٹے بچوں پر آرام کی، سکون کی چادر تان دیتی ہے۔ پھر رات بھی چلی جاتی ہے، پھر صبح نمودار ہوتی ہے اور خلقت بیدار ہوتی ہے۔

Scanned by CamScanner

اب پرندہ پکڑنے والی گاڑی کم آتی ہے۔دو چار دنوں میں ،آٹھ دس دنوں میں، پندرہ بیس دنوں میں ایک بار آتی ہے۔رنگین شیشوں میں سے ایک آدھ پرندہ، حیرت سے بازار والوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔گاڑی والے اِدھر اُدھر تیز نگاہوں کا جال پھینکتے ، پھر سمیٹتے اور چاروں اور متجسس نظروں سے دیکھتے، ڈھونڈتے ڈھانڈتے آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چلے جاتے ہیں، کبھی کچھ ملتا ہے کبھی کچھ نہیں ملتا، کوئی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

ایک ایسا ہی دن تھا، دھوپ بہت سخت تھی، ہوا گرم تھی، فضا میں دھول اُڑ رہی تھی، جھکڑ چل رہے تھے، جسموں سے پسینہ بہہ رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح گرم گرم ہوا پھینک رہی تھی کہ گاڑی آ گئی۔

گاڑی آ گئی، پرندہ پکڑنے والی گاڑی آ گئی.....

گاڑی عین چوک پر کھڑی ہوگئی۔رنگین شیشوں کے اندر ایک ہی پرندہ تھا، جو ادھر اُدھر سہمے سہمے قدم ٹہل رہا تھا۔سفید سا، اس کی دُم مور کی طرح کھلی تھی، اور آنکھوں میں افسردگی جھلک رہی تھی۔ابھی گاڑی ٹھہری ہی تھی کہ دوڑتا ہوا، وہ دس سالہ بچہ آ پہنچا۔اس نے پہلے گاڑی والوں کو دیکھا، پھر شیشے کے اندر جھانک کر دیکھا، ذرا دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد دفعتاً اس نے لپک کر شیشے کے چھوٹے سے دروازے کو کھول دیا۔

اتنی ہی پھرتی سے بانس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا، پھر دروازے کو بند کر دیا اور جیب سے بہت سارے سکے نکال کر سامنے اچھال دیے۔لڑکے نے سکوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔بانس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اسے ایک طرف دھکا دے دیا اور پھر سکے اچھال دیے، لڑکے نے سکوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔گاڑی تیزی سے چلنے

Scanned by CamScanner

لگی اس کے پیچھے پیچھے بانس والا آدمی تیز تیز قدموں سے چلنے لگا، پھر گاڑی اور تیز ہوگئی۔ آدمی کے قدم بھی تیز ہوگئے۔ اب وہ دوڑنے لگے۔

لڑکا کچھ دیر خاموش، حیرت اور افسردگی سے تکتا رہا پھر جانے کہاں سے اس کے قدموں میں بجلی کی سی جھپٹ آگئی۔ اس نے دہل کر بھاگتی ہوئی گاڑی کو دیکھا، پھر دوڑتا ہوا اسے جالیا اور شیشوں پر زور سے گھونسہ مارنے والا ہی تھا کہ بانس والے آدمی نے اس کے وار کو اپنے ہاتھ پر روک لیا اور بچے کو زور سے..... بہت زور سے دھکا دیا۔

لڑکا گیند کی طرح سڑک پر لڑھک گیا۔ اس کے سر اور گھٹنوں پر سخت چوٹ آگئی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور دیر تک وہ سڑک کو تاکتا رہا، پھر جب اس کی بینائی پر چھایا ہوا اندھیارا ہٹا اور اس نے غور سے دیکھا تو گاڑی دور ڈھلان پر تیزی سے بھاگی جارہی تھی اور اس کے پیچھے صرف دھول ہی دھول تھی۔

لڑکے نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اس کے گھٹنوں کے درد نے اُٹھنے نہیں دیا۔ اور وہ پھر تلملا کر سڑک پر گر گیا۔

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ گاڑی میں لگی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی سحر زدہ آواز کانوں سے اوجھل ہوگئی، اور بہت دیر ہوگئی..... بہت..... بہت دیر....

جب بہت دیر ہوگئی تب وہ لڑکا سڑک پر سے اُٹھا پہلے اس نے اپنے لہولہان گھٹنوں کو دیکھا پھر اپنے کپڑوں کی دھول جھاڑی اس کے بعد اپنی آستین سے آنکھیں پونچھتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے چل کر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

''بھائی جان لقا کبوتر بھی چلا گیا.....'' اس نے گویا اپنے آپ کو اطلاع دی۔

Scanned by CamScanner

''ہاں میاں، لقا بھی چلا گیا۔'' میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

ذرا دیر تک وہ سڑک کی اور دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں ڈھلان کی طرف دوڑ گئیں، جہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے دھیرے سے نیکر کی اس اُبھری ہوئی جیب پر ہاتھ پھیرا جہاں ماچس کی ڈبیہ تھی۔

''بھائی جان..... اس، اس تتلی کو بھی لے جائیں گے نا؟''

''.....''

''جب تتلیاں چلی گئیں تو کیا بچے گا شہر میں؟؟''

جواب میں میں خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، جہاں آنسوؤں اور سڑک کی دھول کے ملے جلے نشان تا حال مایوسیوں کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ وہ لڑکا چونکا اور اس نے سامنے والی بڑی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

''بھائی جان، بھائی جان، وہ دیکھئے.....''

عمارت کے دروازے کے اوپر پتھر کا ایک پرندہ سر نہوڑائے بیٹھا تھا.....

میری اور اس دس سالہ معصوم بچے کی نگاہیں دیر تک پتھر کے اس پرندے پر لگی رہیں۔

قلم کار حضرات سے التماس ہے کہ وہ تحریریں صفحہ کی ایک جانب صاف اور خوش خط لکھ کر روانہ کریں۔ کمپوزڈ شدہ تحریریں پروف ریڈنگ کے بعد ہی ارسال کریں۔

Scanned by CamScanner

غیاث احمد گدی کا افسانہ

''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'': ایک تجزیہ

خورشید اکرم

غیاث احمد گدی کا تعلق جدید افسانہ نگاروں کی نسل سے ہی تھا تاہم وہ اس طرح غالی جدیدیے نہیں تھے جو افسانے میں ناقابلِ فہم اور مبہم تجربوں پر بھی فاخر رہے۔ اگرچہ ان کی حسیت جدید تھی اور جدید افسانے کی ہموار کردہ زمین سے انہوں نے مقدور بھر خوب فائدہ اٹھایا۔ میرے خیال میں انہوں نے اس پکوان کو ذرا ٹھنڈا ہونے دیا، پھر کھایا۔ اس لیے نہ ان کا منہ جلا نہ ہاضمہ بگڑا۔ جدید افسانہ نگاروں کے اس قافلے میں سریندر پرکاش واحد افسانہ نگار تھے جنہوں نے اپنے ہی قدموں کے نشان پر چلتے رہنے کے بجائے اپنے تخلیقی سفر کے لیے نئے راستے چنے۔ غیاث احمد گدی بنیادی طور پر سیاسی، سماجی شعور کے افسانہ نگار تھے اور معاشرے پر اثر انداز ہونے والے عوامل ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھے۔ 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' غیاث کے اسی مخصوص مزاج کی نمائندہ اور مشہور ترین کہانیوں میں سے ہے۔

مختصراً بیان کیا جائے تو کہانی یوں ہے کہ شہر میں پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے۔ پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے مگر لوگوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ شہر کا بازار پر رونق ہے، لوگ باگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ راوی جو کہ ایک افسانہ نگار ہے حلوائی سے بات کرتا ہے کہ جلیبیوں پر یہ اتنی مکھیاں تو اسے جواب ملتا ہے ''مگر تم کو کیا صاحب! تم کو تو نہیں

Scanned by CamScanner

خریدنا'' ''اور مجھ کو کیا صاحب مجھ کو بھی تو نہیں کھانا''۔ پھر اس آگہی کے آشوب میں گرفتار افسانہ نگار کو ایک دس گیارہ سالہ لڑکا ملتا ہے جو راوی کی پریشانی میں شریک ہوتا ہے کیونکہ اسے ڈر ہے کہ ایک دن یہ پرندہ پکڑنے والی گاڑی اس کے لقا کبوتر کو بھی لے جائے گی جس کے پروں کی ہوا سے اس کی لقوہ زدہ باجی کا علاج ہو رہا ہے۔ مگر وہ بچہ ہنس سکتا ہے کہ اس کی جیب میں دھری ماچس کی ڈبیا میں ایک خوش رنگ تتلی ہے۔ مگر وہ افسانہ نگار نہیں ہنستا'' کیسے ہنسوں میاں، اس کارگہہ شیشہ گری میں ہنسنا کوئی کھیل ہے؟'' یہاں میں کہانی کے تسلسل کو روک کر ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دراصل یہ فقرہ غیاث کی پوری افسانہ نگاری کا منشور ہے۔ ان کی تمام کہانیوں میں تناؤ، گھٹن، افسردگی معاشرہ کی بے ضمیری، بے حسی پر تیکھا تبصرہ/ردعمل نظر آتا ہے۔ خیر! کہانی کی طرف لوٹتے ہیں۔ پھر ایک روز وہ جو افسانہ نگار بھی ہے منّی بائی کے کوٹھے پر پہنچ جاتا ہے جو اس کی آمد سے مطلق بے خبر اپنے طوطے کو پڑھانے میں محو تھی، ''بولو میاں مٹھو، نبی جی روزی بھیجو!'' وہ تو منی بائی کی روزی بن کر کوٹھے پر پہنچ جاتا ہے لیکن خود اس کی روزی کیا ہے۔ دو روپیہ فی کہانی بلکہ اس سے بھی کم۔ جس پر منی بائی کہتی ہے۔ ''واقعی ہمارا دھندہ تمہارے دھندے سے بہت اچھا ہے''۔ مگر افسانہ نگار کی دلچسپی منی بائی میں نہیں اس کے طوطے میں ہے جس کے بارے میں اسے اندیشہ ہے کہ پرندہ پکڑنے والی گاڑی ایک دن اسے بھی لے جائے گی پھینکے ہوئے سکوں کے عوض۔ ''بہت سے سکے مل جائیں تو ہیرا من کو کون روتا ہے؟'' منی بائی کہتی ہے۔ تب اس طوطے کے تحفظ کی ذمہ داری افسانہ نگار اپنے قلم کو سونپتا ہے۔ وہ اپنی مفروضہ کہانی میں اپنی باغی روح طوطے کی جان میں ڈالتا ہے یوں کہ جب پرندہ پکڑنے والے طوطے کو دبوچنے کو ہوتے ہیں کہ طوطا ان پر حملہ کرتا ہے۔ وہ ایک کی

Scanned by CamScanner

گردن کا گوشت نوچ لیتا ہے اور دوسرے کے سارے چہرے کو نوچ کر لہولہان کر دیتا ہے .....مگر اس کے آگے کہانی کار بے بس ہے کیونکہ تبھی منی بائی جلدی سے کہہ اٹھتی ہے۔ ''میں لپک کر جاتی ہوں اور اپنی چادر طوطے پر ڈال دیتی ہوں، اس کو پکڑ کر گاڑی والے کے حوالے کر دیتی ہوں اور اس سے بہت سے.....'' جب بہت سے پیسے ملنے والے ہوں تو کیا میں طوطے کو یہ سب کرنے دوں گی.....؟ منی بائی حقارت سے میری طرف دیکھتی ہے اور تھوک دیتی ہے۔ ''ایسے ہی کہانی لکھی جاتی ہے.....جی؟'' تب کہانی کار ہونی کا احوال لکھتا ہے'' پھر گاڑی والے 'نبی جی روزی بھیجو' کی منت کرنے والے طوطے کو بھی لے جاتے ہیں۔ تا آنکہ ایک گرم دوپہر گاڑی کے رنگین شیشوں کے پیچھے لقا کبوتر بھی نظر آتا ہے جس کو آزاد کرانے کے لئے معصوم بچہ اپنی سی جدوجہد کرتا ہے لیکن بزور طاقت ناکام کر دیا جاتا ہے۔ لقا چلا گیا۔ اب راوی اور وہ معصوم بچہ سامنے کی اس بڑی سی عمارت کو دیکھ رہے ہیں جس کے دروازے کے اوپر پتھر کا ایک پرندہ سر نہوڑائے بیٹھا تھا۔

یہ جدید افسانے کے عروج کے زمانے کی کہانی ہے جب تجرید اردو افسانے کا غالب رجحان تھی۔ اس ذیل میں خالدہ اصغر کی کہانی 'سواری' کے حوالے سے بھی تھوڑی گفتگو لازمی ہے لیکن اس پر گفتگو آخر میں۔ اس وقت یہ نشان زد کرنا مقصود تھا کہ علامتیت سے اس کہانی نے بھی استفادہ کیا لیکن کہانی حقیقت پسند بیانیہ اور علامت دونوں سطحوں پر چلتی ہے۔ بعد کی اردو کہانی نے کہانی کے ان دونوں طرزوں سے استفادہ کیا لیکن جب پرندہ پکڑنے والی گاڑی لکھی گئی تھی تب تک شاید ہمارے دیگر افسانہ نگار اس امتزاج کو برتنے پر اس قدر قادر نہ ہوئے تھے۔ علامتی افسانہ نگاروں کو چھوڑیں، اقبال مجید جیسے افسانہ نگار نے بھی

Scanned by CamScanner

علامتیت کو قبول کیا تو پیٹ کے کیچوے جیسی ابہامی کہانی ہی لکھی۔ ایک کہانی کے حوالے میں اس عہد کے افسانے کے بعض خصائص پر گفتگو سے یہاں میرا منشا یہ ہے کہ ہم غیاث احمد گدّی کے فکر وفن کو وسیع تناظر میں دیکھیں۔ جوان کی اس کہانی میں اپنی ارفع سطح پر پہنچتا ہے۔

کہانی سے چار شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ایک وہ رنگین شیشوں والی گاڑی ہے بقول منی بائی جس کے پیلے پیلے، لال لال خوبصورت شیشوں میں سے پرندے چہکتے ہوئے بہت بھلے دکھتے ہیں۔ گویا عوام کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جسے یہ قید بھی بھلی لگنے لگی ہے۔ اور وہ دو پرندے پکڑنے والے---- یہ دو کون ہیں---- بے حد زرد رو گویا جن کے اندر زندگی کی کوئی حدّت نہیں، جذبات نہیں، اور آنکھیں نیم وا گویا بصیرت سے عاری۔ اور کمر خمیدہ یعنی زندگی کی طاقت سے محرومی کے کگار پر، پھر بھی پرندے، جو فطری آزادی کی علامت ہیں انہیں پکڑ پکڑ کر لئے جا رہے ہیں---- سوال یہ کہ یہ دونوں کون ہیں۔ کہیں یہ ہمارے ملکی نظام کو چلانے والے دو بازو یعنی Legislative اور Executive تو نہیں۔ کاروبارِ حکومت انہی دونوں سے چلتا ہے۔ یہاں ممکن ہے کہ یہ سوال آئے کہ پرندوں کو پکڑ کر کیوں لے جایا جا رہا ہے اور کہاں..... تو کہانی یہ تو بتاتی ہے کہ گاڑی ''اتری علاقے کے سخت ڈھلان میں اتر چکی تھی'' لیکن کیوں، یہ نہیں بتاتی۔ شاید یہ کیوں وہ ہے جسے Beyond Poetry Question کہتے ہیں۔ کہانی ہر سوال کا شافی جواب دے یہ ضروری نہیں۔ ادب کی حد پرواز فضا تک ہے۔ وہ خلا جو کششِ ثقل سے باہر ہے، وہاں تک رسائی علوم کی ہے۔ ادب انسانی دکھوں سے سروکار رکھتا ہے اس لیے وہ جاسوس کی طرح نادیدہ ہاتھ تک پہنچے بغیر بھی انسانی آلام کو بیان کر کے اپنا فرض ادا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

کہانی کی دوسری شاخ وہ معاشرہ ہے جس کو اس بات سے کوئی مطلب نہیں کہ اب ''درختوں پر بسیرا لینے والی چڑیوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی'' اس کے بازار اور رونق بازار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ خرید و فروخت جاری ہے۔ شور شرابہ، یکّے والوں کا کھٹ کھٹ، ٹم ٹم والوں کے گھوڑوں کی گھنٹیاں بجتی رہتی، لمبی اور خوبصورت کاریں زوں زوں کر کے گزرتی جاتی ہیں..... خریدنے والے اسی طرح بازار کی دکانوں پر جمے رہتے ہیں اور بیچنے والی اسی انہماک سے سودا سلف بیچ رہے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے کہ جاری ہے۔ ایک دوڑ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی''۔ اور اس معاشرے کے نمائندے کون ہیں؟

(i): سکّے چننے میں محو ہو جانے والے ''لین دین کا بازار اتنا جوان ہوتا ہے کہ اول تو گاڑی کی طرف کسی کی نظر ہی نہ اٹھتی۔ لیکن ان میں سے کسی کی نظر اٹھ بھی جاتی تو وہ سحر زدہ سا اس عجیب و غریب گاڑی اور اس کے حُسن کو دیکھنے میں کھو جاتا---- کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی آدمی چونکتا اور ذرا حوصلے سے اٹھتا'' گاڑی والے جب اس آدمی کو قریب آتے دیکھتے جو جھٹ اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور چند سکے نکال کر اس کی طرف اچھال دیتے۔ وہ آدمی سکے چننے میں ایسا محو ہو جاتا کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہتا۔''

(ii): شہر میں بیماری پھیلی ہے تو کیا، وہ حلوائی ہے جو جلیبیوں کے ساتھ رس سے لت پت مکھی بھی تول کر منافع کما رہا ہے۔

(iii): وہ منی بائی ہے جو سکوں کے عوض اپنی عزیز شئے کو بھی فروخت کر رہی ہے کہ بازار کھلا ہے تو وہ شئے اور لے آئے گی۔ حالانکہ راوی جو پیشے سے افسانہ نگار ہے اسے بتاتا ہے ''اے منی بائی، ہوش کے ناخن لو، یہ دنیا ہے۔ اور دنیا سالی بڑی مطلبی ہوتی ہے۔ مان

Scanned by CamScanner

لو..... بازار میں طوطا نہ ملا اور ملا تو ایسا پڑھنے والا نہ ملا اور پڑھنے والا بھی مل گیا تو اس کی زبان میں یہ تاثیر....." ۔ بے جواب ہو جانے والی منی بائی کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے اور اپنے سمجھانے والے کو ہی لاجواب کر دیتی ہے۔

کہانی کی تیسری شاخ وہ افسانہ نگار ہے جو اپنی آگہی کے آشوب میں گرفتار ہے۔ وہ اپنی کہانی سے معاشرے کو جگانا چاہتا ہے، اس کی بے حسی اور بے ضمیری پر جھنجھوڑنا چاہتا ہے، لیکن معاشرہ ہے کہ بے خبر اپنے کاروبار میں منہمک ہے۔ الٹے اس کا قلم خود استحصال کا شکار ہے۔ ذرا کہانی کی بے وقعتی تو ملاحظہ کیجئے کہ ایک تو دو روپے فی کہانی..... وہ بھی آٹھ کے چودہ ہی روپے۔ کیونکہ آدھی کہانی تو پاسنگ میں چلی گئی---- باقی آدھی؟ جریدے والا بگڑ گیا۔ ترشی سے کہا "اتنا جھک گیا تو دم نکل گیا تمہارا۔ کیا سونا تول رہے ہو۔ کہانیاں ہی تو ہیں۔" ذرا رُک کر آہ بھر لوں..... تو آگے کچھ عرض کروں۔ یہ کہانی کا انتہائی خوبصورت ٹکڑا ہے۔ غیاث احمد گدی نے اپنی کئی کہانیوں میں افسانہ نگار کی معاشرے میں بے وقعتی، اس کے استحصال کو اجاگر کیا ہے لیکن اس کہانی کے اس حصے میں وہ افسانہ نگار کے دردِ دل کا سارا احوال سنانے میں کامیاب ہو گئے۔ وقت (جگہ) کی تنگی نہ ہوتی تو میں شاید یہاں پورا صفحہ نقل کرتا۔

کہانی کی چوتھی شاخ وہ معصوم بچہ ہے جو اپنی بیمار بہن کی محبت میں لقا کبوتر کے لیے فکر مند ہے حالانکہ خود اس نے ایک ننھی معصوم تتلی کو قید کر رکھا ہے۔ یہ معاشرے کے اس طبقہ کا نمائندہ ہے جو گرچہ بے حس، بے ضمیر، بے ایمان نہیں ہے لیکن اسے معاشرے کے آلام تب ہی نظر آتے ہیں جب ان کی اپنی زندگی ان سے متاثر ہوتی نظر آ رہی ہو جب کہ خود اپنی خوشی کے لیے وہ دوسرے کی آزادی سلب کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ گرچہ اسے اس بات

Scanned by CamScanner

کا شعور نہیں ہوتا۔

کہانی کی یہ جہتیں اگر اپنے کو آپ پر آشکار کرنے میں کامیاب ہیں تو آپ سامنے والی بڑی سی عمارت کے دروازے کے اوپر سر نہوڑائے بیٹھا پتھر کا پرندہ دیکھ سکتے ہیں۔

مزید اور مختصراً کہنا ہو تو دراصل یہ کہانی ملکی نظام کے خلاف ہے۔ غیاث، اس کہانی سے پہلے نکسل واد پر ایک کہانی 'ناردمنی' لکھ چکے تھے۔ سن ستر تک آتے آتے ہماری intelligentia اپنے جمہوری نظام سے مایوسی کا اظہار کرنے لگی تھی۔ جدید نسل کے ہمارے بیدار شعور افسانہ نگار جدیدیت کے درآمد شدہ مسائل و موضوعات سے دامن چھڑا کر زمینی حقائق کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ فوری طور پر اسی موضوع نے ہمارے جدید افسانہ نگاروں کو سب سے زیادہ اپیل کیا۔ اس وقت میں تحقیقی طور پر تو یہ ثابت نہیں کر سکتا لیکن اپنے محدود مطالعے اور کمزور حافظے کو کرید کرید کر دیکھ رہا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید نظام کے جبر کے خلاف یہ اردو میں لکھی گئی ابتدائی کہانیوں میں سے ایک ہو جس کا سب سے نمایاں وصف شفاف حقیقت پسند بیانیے میں علامتیت کا متوازن امتزاج ہے۔ یوں کہانی میں ایسا گہرا رمز پیدا ہوا ہے۔ جو اپنے ہم عصروں میں غالباً صرف غیاث احمد گدی کا خاصہ تھا۔

آخر میں پس نوشت کے طور پر اس کہانی پر تھوڑی سی گفتگو 'سواری' (خالدہ اصغر) کے حوالے سے۔

میں نے کہانی کی ارفع فہم رکھنے والے کئی لوگوں سے سنا ہے کہ جب 'سواری' لکھ دی گئی تو پھر 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ میں خود کو تا حال اس خیال سے کچھ متفق پاتا رہا۔ لیکن 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' کے تجزیے کا بار آپڑا تو میں نے

Scanned by CamScanner

حال ہی میں 'سواری' ایک بار پھر پڑھی۔ یہاں ایں وآں کے درمیان مقابلہ آرائی مقصود نہیں ہے۔ لیکن حافظے میں دونوں کہانیاں تازہ ہیں اس لیے اپنی ٹوٹی پھوٹی رائے قلمبند کر دوں تو کیا ہرج ہے۔ غیاث احمد گدی کی کہانی واضح طور پر جمہوری نظام کے خوشنما جبر کے خلاف ہے جس کا احساس ابھی معاشرے کے حساس طبقے کو ہوا ہے یا اس معصوم کو جس کی متاع عزیز پر اس جبر کا عذاب اترنا لازمی و قریب ہے۔ 'سواری' پے بہ پے فوجی حکومتوں کے جبر میں گھٹتے اس معاشرے کی کہانی ہے جس کی 'بدبو' پورے سماج میں پھیل چکی ہے۔ سواری کہانی کی فضا اول تا آخر علامتی ہے، تجریدی ہے۔ کرداروں کی یہاں تجسیم نہیں ہوتی۔ وقوعات کی زمینی حقیقت نہیں ہے۔ راوی کے اپنے بیان میں اس کی بیوی اور بچہ آتے ہیں مگر وہ گوشت پوست کے وجود کم Manequinn زیادہ لگتے ہیں۔ دفتر کے ساتھی بھی کہانی کے ایک سرے کو سہارا دینے بھر ہی کام آتے ہیں۔ اس سے آگے اس کہانی کی کہانویت ہمارے ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ البتہ افسانے کا دھندلکا اپنی گہری تاثیریت کے ساتھ حافظے میں جگہ بنا لیتا ہے۔

غیاث کی کہانی، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا علامتیت اور شفاف بیانیہ کا نہایت حسین امتزاج ہے۔ معنوی طور پر یہ سواری سے الگ ہونے کے علاوہ فنی طور پر بھی 'سواری' سے مختلف ہے۔ کیا ان میں سے کسی کہانی کو دوسری پر کوئی فوقیت حاصل ہے یا ایک دوسری کے عدمِ جواز کی دلیل بن سکتی ہے؟ ●●

Scanned by CamScanner